شہزاد احمد کا سائنسی شعور

ڈاکٹر سعید احمد

Dr. Saeed Ahmad

Assistant Professor, Department of Urdu,
Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:

"Shehzad Ahmad was a well known poet, prose writer,critic, translator and intellectual. He possessed deepknowledge of science, Philosophy and Psychology. He translated many English books of these disciplines into Urdu. With these translations, he enriched the Urdu language.

Shehzad Ahmad was a stylist, visionary, and a scholar poet. The empirical and intellectual aspects of his poetry proved him a great and important poet. Along with traditional topics of knowledge and cognition theecho of scientific theories and principles can be heard in his poetry. The deep insight of science and philosophy gave the variety of themes to his poetry. Shehzad Ahmad was a distinguished poet and was very prominent among the fellows of his age. Shehzad made a valuable contribution in the scientific Urdu poetry. In this article the scientific consciousness of Shehzad Ahmad is examined."

شہزاد احمد معاصر اردو ادب کا ایک درخشندہ باب ہے۔ شاعری، سائنس، فلسفہ، نفسیات شہزاد احمد کی دل چسپی کے خاص میدان ہیں۔ شہزاد احمد نے ان علوم میں تصنیف و تالیف کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ خصوصاً سائنس، فلسفے اور نفسیات کی گراں قدر کتابوں کے معیاری تراجم سے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کر دیا ہے۔ شہزاد احمد کے تبحر عملی اور ژرف نگاہی کا اندازہ کرنے کے لیے ان کے علمی و ادبی کارناموں پر نظر ڈالنا مفید ہوگا۔ شہزاد احمد کے مجموعہ ہائے کلام کی فہرست درج ذیل ہے:

صدف (۱۹۴۸ء)، جلتی بجھتی آنکھیں (۱۹۶۹ء)، ادھ کھلا دریچہ (۱۹۷۷ء)، خالی آسمان (۱۹۸۵ء)، بکھر جانے کی رت (۱۹۸۷ء)، دیوار پہ دستک (مذکورہ بالا مجموعوں پر مشتمل کلیات، ۱۹۹۱ء)، کون اسے جاتا دیکھے (۱۹۹۴ء)، پیشانی میں سورج (۱۹۹۵ء)، جاگن والی رات (پنجابی، ۱۹۹۶ء)، اترے مری خاک پر ستارہ (سپیس کے بارے میں نظمیں، ۱۹۹۷ء)، معلوم سے آگے (۱۹۹۸ء)، اندھیرا دیکھ سکتا ہے (۱۹۹۹ء)، ایک اور چراغ بھی (۱۹۹۹ء)، آنے والا کل (۲۰۰۴ء)، مٹی جیسے لوگ (۲۰۰۸ء)۔

سائنس اور نفسیات کے موضوع پر شہزاد احمد نے متعدد کتب تصنیف و تالیف و ترجمہ کیں:

مذہب، تہذیب، موت (فرائیڈ کے نظریہ جبلت مرگ کا مطالعہ اور اطلاق، ۱۹۶۲ء)، تخلیقی رویے (سائنسی فکر سے متعلق ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ۱۹۸۶ء)، ذہنِ انسانی کا حیاتیاتی پس منظر (ذہن کے بارے میں جدید تر نظریات کا ایک مطالعہ، ۱۹۸۷ء)، سائنسی انقلاب ___ یقین سے امکان تک (فلسفہ سائنس پر ایک کتاب، جدید سائنسی فکر کا ایک مطالعہ، ۱۹۹۰ء)، دوسرا رخ (بعض جدید تصورات پر چند فکری کالم، ۱۹۹۰ء)، ارمان اور حقیقت (ڈاکٹر عبدالسلام کے مضامین کا ترجمہ، کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر عبدالسلام نے اردو میں تحریر فرمایا، ۱۹۹۳ء)، فرائیڈ کی نفسیات کے دو دور (فرائیڈ کے جنس اور جبلت مرگ کے نظریات کا مطالعہ، ۱۹۹۴ء)، آج اور کل، سائنس کے آئینے میں (آئزک ایسیموف کے مستقبلیات کے بارے میں چند مضامین کا ترجمہ، ۱۹۹۵ء)، سائنس کے عظیم مضامین (مارٹن گارڈن کی ایک کتاب سے چند مضامین کا ترجمہ، ۱۹۹۶ء)، وقت کی رفتار (اسٹیفن ہاکنگ کی شہرۂ آفاق کتاب کے ایک ترجمے پر نظر ثانی، ۱۹۹۸ء)، ژونگ کی نفسیات اور مخفی علوم (ژونگ کا ایک خصوصی مطالعہ، ۱۹۹۸ء)، الفریڈ ایڈلر کی انفرادی نفسیات اور احساسِ کمتری (ایڈلر کا ایک خصوصی مطالعہ، ۱۹۹۹ء)، گرڈ جیف معجزے کی تلاش میں (۲۰۰۱ء)، اوس پنسکی، نیند اور عادت کے خلاف جنگ (۲۰۰۲ء)، شوماخر، پریشان حالی سے نجات (۲۰۰۳ء)، ابراہام ماسلو اعلیٰ ترین انسانی واردات (۲۰۰۴ء)، وجودی نفسیات پر ایک نظر (۲۰۰۵ء)، شہزاد احمد نے اسلامی فکر و فلسفے پر لکھی گئی بلند پایہ کتب کے نہایت شاندار اردو تراجم پیش کیے۔

اسلامی فکر کی نئی تشکیل (خطباتِ اقبال کا ترجمہ)، اسلام کی پہچان (شوان کی کتاب Understanding Islam کا ترجمہ)، اسلامی فلسفے کی تاریخ (ماجد فخری کی ایک کتاب کا ترجمہ)، محمد الرسول اللہؐ (این میری شمل کی کتاب Muhammad and His Messenger کا ترجمہ)، اسلامی آرٹ (برک ہارٹ کی کتاب Art of Islam کا ترجمہ)، اسلامی ثقافت (ڈاکٹر محمد افضل کی کتاب Culture of Islam کا ترجمہ)، اسلامی سائنس (حسین نصر کی کتاب Islamic Sciences کا ترجمہ دو جلدوں میں)، مسلم فلسفہ کی تاریخ (ایم ایم شریف کی کتاب کی پہلی جلد کا ترجمہ)۔

شہزاد احمد کا پہلا شعری مجموعہ ''صدف'' ۱۹۸۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ''صدف'' کا ابتدائیہ مظفر علی سید نے تحریر کیا اور شہزاد کی شاعری پر یگانہ کے اثرات کی نشان دہی کی۔ شہزاد احمد نے ''صدف'' میں غزل کی روایتی مضامین کو اپنے مخصوص رنگ سے باندھا ہے۔ روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے استعارات بھی نظر آتے ہیں۔ ''صدف'' میں شہزاد احمد کے یہاں رنگ و نور کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ خصوصاً روشنی اور اس کے متعلقات سے یہ مجموعہ بھرا پڑا ہے۔ ''صدف'' میں شہزاد کے دائرۂ فکر کا مرکزی استعارہ ''ستارہ'' ہے۔ بیشتر اشعار میں ستاروں، چراغوں اور جگنوؤں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ مجموعہ چاند، ستاروں، سورج اور دیگر اجرامِ فلکی کے ذکر سے جھلملاتا نظر آتا ہے۔ شہزاد کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

سیہ کدوں میں ابھی ایک کرن نہیں پہنچی
اگرچہ ایک زمانے سے جل رہے ہیں کنول(۱)

یہ کائنات تاریکی کا ایک بیکراں سمندر ہے جس میں کہیں کہیں روشن ستاروں کے جزیرے ہیں۔ یہ روشنی کے جزیرے سارے سمندر کی نسبت اتنے چھوٹے ہیں کہ سمندر کا بیشتر حصہ ہمیشہ تاریکی میں ڈوبا رہتا ہے۔ ایک روشن جزیرے کی روشنی اکثر و بیشتر دوسرے جزیرے تک نہیں پہنچتی۔ یہ مسلمہ سائنسی حقیقت ہے کہ بعض ستارے زمین سے لاکھوں کروڑوں نوری سال کی مسافت پر ہیں اور ان ستاروں سے نکلنے والی روشنی ابھی تک زمین پر نہیں پہنچی۔ ''صدف'' سے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

ذرے کے نور کی کرن تختِ خدا کو چھو گئی
پھر بھی نگاہِ خلق میں تیرہ ہے کائنات ابھی(ص۲۴۶)

جلوۂ مہتاب بھی شعبدۂ خیال ہے
رات کے پاس کچھ نہیں صبح کا انتظار کر(ص۲۵۸)

آخرِ شب یوں برستے ہیں مری آنکھوں کے اشک
قطرہ قطرہ ہو کے جیسے خون ٹپکے سنگ سے(ص۳۶۶)

شہزاد کے دوسرے شعری مجموعے ''جلتی بجھتی آنکھیں'' کے ابتدائیہ میں مختار صدیقی نے شہزاد کی غزل کو وجدان اور شعور کا حسین امتزاج قرار دیا ہے۔ شہزاد کی غزل میں ذات کا بیان بھی ہے اور کائنات کے اسرار کا اظہار بھی۔ بقول مختار صدیقی:

''شعور ذات کی کاوشوں کے کئی پہلو، شہزاد کے ہاں نمایاں ہیں۔
ایک پہلو یہ ہے کہ اپنے آپ کو انسانی مسائل کے سیاق و سباق اور
ان کے حوالے سے جاننے کی کوشش کی جائے اس لیے محبت کا ایک

خاص انداز ان کے ہاں ہے۔ محبت کا جسم اور اس کا وجود ہے تو سہی ،مگر ایک حقیقت کی بجائے، ایک ''تصورِ غم'' زیادہ بن چکا ہے۔ سماجی مسائل کا ہلکا سا پرتو ہے کہ ان کی لطافت بیان، زیادہ ٹھوس طرزِ تکلم کی متحمل نہیں! چنانچہ غم دوراں کے اس عہد کی نظم و غزل کا موضوعی مرکز ہے، شہزاد کی غزل میں اتنا نہیں کہ وہ ان کے رنگ سخن کا سب سے شوخ رنگ بن جائے لیکن جس انکشاف کی شعوری کوشش، شہزاد کے ہاں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات اور آفاق کے سیاق وسباق میں ان کے حوالے سے اپنا انسانی مقام بلکہ انفرادی مقام متعین کیا جائے۔''(۲)

شہزاد احمد کے اس دوسرے شعری مجموعے سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

پیکرِ خاکی نے ڈالی ہے ستاروں پر کمند
خاک کے سینے سے اِک سورج نیا پیدا ہوا(ص۲۹۴)

بے نور آسماں ہے ، خلاؤں کا ہے سفر
پاؤں مرے کوئی مرے سائے سے باندھ دے(ص۴۳۷)

فلک کی سیر کے بعد آکے اپنی خاک کو چوم
ہیں اس کے ذروں میں بھی مہر جگمگاتے ہوئے(ص۴۶۵)

گراڑے بھی ہم تو منزل پھر وہی مٹی کے گھر
آسمانوں کی بھی آخر خاک پر بنیاد ہے(ص۴۷۱)

رفتار ہے ایسی کہ ٹھہرتی نہیں آنکھیں
ہے چرخ بھی چکر میں ، ستارہ بھی رواں ہے(ص۴۹۰)

اب تو شہزاؔد ستاروں پہ لگی ہیں نظریں
کبھی ہم لوگ بھی مٹی میں جیا کرتے تھے(ص۴۹۹)

لحظہ بہ لحظہ رنگ بدلتی ہے کائنات
یعنی طلسمِ ہوشربا میرے ساتھ ہے(ص۵۰۷)

آنکھ روشن ہے ، ستاروں کا جہاں دیکھے گی
خاک زنجیر ہے ، پاؤں نہ اٹھانے دے گی(ص۵۱۰)

مندرجہ بالا اشعار پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اگرچہ عرش کی بات کرتا ہے لیکن فرش سے اس کا رشتہ ہمہ وقت استوار رہتا ہے۔

شہزاد کے تیسرے شعری مجموعے ''ادھ کھلا دریچہ'' میں فکر و احساس کا رنگ زیادہ گہرا ہوتا نظر آتا ہے۔ عمرانی شعور کے ساتھ ساتھ سائنسی فکر پہلے سے زیادہ پختہ معلوم ہوتی ہے۔ مذکورہ مجموعے سے چند اشعار دیکھیے:

پھرتے ہیں بے نیاز ستاروں کو کیا خبر
اترا نہیں خلا کا شکاری مچان سے(ص۵۵۰)

دیکھیے سورج کی آنکھوں میں نہ آنکھیں ڈال کر
اِک کرن بھیجے گا ، بینائی چرا لے جائے گا(ص۵۵۶)

خود سرکتی جا رہی ہے پاؤں کے نیچے زمیں
کیا خبر مجھ کو کہاں یہ راستہ لے جائے گا(ص۵۵۶)

چرخ کی سمت ہے اب خاک نشینوں کا سفر
روشنی لے کے چلے نور کے ہالوں کے لیے(ص۵۷۳)

طواف کرنا تھا صدیوں تک اپنے سورج کا
مجھے زمیں کی طرح بے قرار ہونا تھا(ص۵۹۰)

بس اب بجھنے کو ہے سورج کی قندیل
جہاں تک جل سکی ، جلتی رہی ہے(ص۵۹۶)

ان اشعار میں بھی شہزاد کے پسندیدہ موضوعات فلکیات اور کونیات کی جھلک دیکھی جا سکتی

ہے۔ زمین و آسمان کے تعلق سے شہزاد نے بہت خوب صورت اشعار تخلیق کیے ہیں۔ شہزاد کے اشعار میں سائنسی فکر کے ساتھ ساتھ شاعرانہ چاشنی بھی بدرجہ اُتم موجود ہوتی ہے۔ محولہ بالا اشعار میں سے آخری شعر سائنسی فکر کے حوالے سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس شعر سے فوراً سر جیمز جینس کا مضمون "The Dying Sun" یاد آجاتا ہے۔

شہزاد احمد کے چوتھے شعری مجموعے ''خالی آسمان'' میں متعدد سائنسی اشعار موجود ہیں۔ اس مجموعے کے بیشتر اشعار میں آسمان کے حوالے سے دل چسپ اشعار ملتے ہیں۔ زمین اور آسمان کا تقابل شہزاد احمد کا پسندیدہ موضوع ہے۔ شہزاد نے اکثر اشعار میں (اقبال کی طرح) یہ سوال اٹھایا ہے کہ آسمان پر کمندِ شوق پھینکنے والا انسان اپنی زمین (کے مسائل) سے غافل نظر آتا ہے۔ شہزاد کو اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ کائنات میں زمین کا وجود ایک حقیر ذرے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود شہزاد زمین کی عظمت کے گن گاتا ہے۔ زمین ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اسے منبعِ خدا حضرتِ انسان کا مامن و مسکن بنایا گیا۔ ''خالی آسمان'' سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

زمین پھیلتی جاتی ہے آسماں کی طرح
میں تھک کے بیٹھ گیا ہوں کہ یہ سفر ہے بہت(ص۶۵۷)

خاک کے پتلے فلک کی سرحدوں کو چھو چکے
اور جسے انسان کہتے ہیں ابھی غاروں میں ہے(ص۶۷۲)

خلاؤں پر تسلط ہو چکا ہے
زمین ہوتی ہے کب تسخیر دیکھیں(ص۶۷۶)

زمین ناؤ مری ، بادباں مرے افلاک
میں ان کو چھوڑ کے ساحل پہ کب اترتا ہوں(ص۶۸۱)

بجھے ہوئے کئی تارے ہیں آسمانوں پر
چھپے ہوئے کئی پتھر ہیں ان زمینوں میں(ص۷۴۷)

ان اشعار میں کئی سائنسی حقائق پوشیدہ ہیں۔ آسمان پھیل رہا ہے۔ دراصل پھیلتی ہوئی کائنات (The Expanding Universe) کی طرف اشارہ ہے۔ زمین کائناتی سمندر کی ایک کشتی کی طرح رواں دواں ہے۔ آسمان پر تارے ٹوٹتے اور بجھتے رہتے ہیں۔

''خالی آسمان'' کی منظومات بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ان نظموں میں فلسفیانہ فکر و احساس نمایاں ہے۔ سائنس اور فلسفے کے گہرے ادراک سے تخلیق ہونے والی ان نظموں میں شاعرانہ آہنگ بھی قابلِ تعریف ہے۔ اس مجموعے میں شامل شہزاد کی ایک نظم ''زہریلی تخلیق'' پیشِ خدمت ہے:

''ایک پل میں ختم ہو سکتی ہے وسعت دہر کی
چوٹیوں سے چوٹیوں تک راستہ آگے خلا
اور خلا کی تیرگی میں دور سے آئی ہوئی کرنوں کے رنگوں کی نمود
آسماں کے پاؤں پر مہتاب و انجم کے سجود
اور زمیں کی رونقوں کا وہم فکرِ رفت و بود
بُن دیے کس نے یہ تار و پود
کس کے ہاتھ میں آیا نظامِ کائنات
کس کے ذرے بن گئے دنیا ستارے آفتاب
کس نے آوارہ خیالی کو پلائی فکرِ شیریں کی شراب
کس نے یہ سب کچھ بنایا؟
اور خود تاریک پردوں میں کہیں بیٹھا رہا
کیا یہ سب پھیلاؤ میرے واسطے ہیں
یا میں خود، اس کی پرانی روح میں بیٹھا ہوا
گن رہا ہوں اس کے اشکوں کی قطار
پونچھتا ہوں اس کے آنسو، مانگتا ہوں اس سے بھیک
(چاہتا ہوں روح کی خاطر سکوں)
وہ تو خود اس خیر و شر کے جال میں اُلجھا ہوا
درس سے بے تاب تخلیقِ اذیت سے نڈھال
چیخ کر کہتا ہے ''مجھ کو مار ڈال''

اس نظم میں خالق اور مخلوق کے رشتے کو فلسفیانہ نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے اور بہت اہم سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ خالق اپنی تخلیق کے ہاتھوں معرضِ اضطراب میں ہے۔ جس طرح انسان نے اپنے خالق کو امتحان میں ڈال دیا ہے۔ بعینہٖ حضرت انسان اپنی تخلیق سائنس (کے تخریبی پہلوؤں) کے ہاتھوں تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اس نظم میں شہزاد کے سائنسی شعور، فلسفیانہ بصیرت اور شاعرانہ احساس کے رنگ دیکھے جا سکتے ہیں۔

زمین بنی آدم کا گہوارہ ہے۔ شہزاد کی شاعری میں زمین اور زمین زادوں کی عظمت کے گیت

سنائی دیتے ہیں۔شہزاد کی ایک خوب صورت نظم ''ستارے اور زمین'' ملاحظہ کیجیے:

اے ستاروں پر کمندیں ڈالنے والو سنو
یہ ستارے خشک پھیکی ریتلی مٹی کے گھر
ان کی چمکیلی جبینیں دوزخی آنکھوں کا نور
ان کی پتھریلی زمینیں بے گیاہ و بے شجر
ان کی آوارہ ہواؤں میں بلندی کا غرور
بے حرارت دھوپ ان کی ان کے چشمے بے سرور

یہ ستارے تیرگی کے بحر میں ننھے جزیروں کے سوا کچھ بھی نہیں:

اور یہ دھرتی مہکتے سبز رنگوں کا جہاں
رات کو مہتاب کی چادر میں لپٹی آبشار
دن کو سورج کی شعاعوں سے دمکتی جوئے بار
اس کے رنگا رنگ ہنگاموں میں روحوں کی صدا
اس کی ویرانی میں بھی آبادیوں کا سلسلہ
اپنی اس تخلیق پر خود مسکراتا ہے خدا

رات دن تارے اسی کو گھورتے رہتے ہیں اور تھکتے نہیں:

''بکھر جانے کی رت'' شہزاد احمد کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔اس مجموعے کی پہلی غزل کا مقطع ملاحظہ کیجیے:

شہزاؔد دل کو ضبط کا یارا نہیں رہا
نکلا جو ماہتاب ، سمندر اچھل پڑے(ص۸۶۲)

یہ شعر سائنسی شعور اور شعری لطافت کا حسین مرکب نظر آتا ہے۔مہتاب صورتِ محبوب کو دیکھ کر دلِ عشاق میں جوار بھاٹا اٹھتا ہے۔عاشق کی اضطرابی کیفیت کو سائنسی حقیقت سے مربوط کر کے کیا خوب مضمون باندھا ہے۔یہ ایک مسلمہ سائنسی حقیقت ہے کہ چودھویں کا چاند سمندر میں مدوجزر کا باعث بنتا ہے۔

شہزاد احمد کا چھٹا شعری مجموعہ ''ٹوٹا ہوا پل'' ان کی زندگی کے ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ فراموش واقعے کی یادگار ہے۔مارچ ۱۹۸۴ء میں شہزاد احمد ہارٹ اٹیک کا شکار ہوئے اور چند ہی لمحوں بعد ان کی موت واقع ہوگئی (شہزاد احمد کو Clinically Dead قرار دے دیا گیا)۔ڈاکٹرز کی انتھک کوششوں سے مصنوعی طریقے سے دل کو چلانے کی کوشش کی گئی جو کارگر ثابت ہوئی اور اس طرح شہزاد احمد کو گویا ایک نئی زندگی عطا ہوئی ''ٹوٹا ہوا پل'' کا انتساب بھی ماہر امراض قلب ڈاکٹر سید اسلم کے نام کیا

گیا ہے۔ (ڈاکٹر سید اسلم کی کتاب ''قلب'' محتاج تعارف نہیں)۔ ''ٹوٹا ہوا پل'' کی اکثر غزلوں اور نظموں میں اس لہجے کی باز آفرینی موجود ہے۔ ''ٹوٹا ہوا پل'' کے آغاز میں شہزاد احمد کا یہ شعر درج ہے:

ترا کرم ہے کہ تو نے مجھے عطا کر دی
وہ زندگی جو کسی اور کو نہ چاہی تھی

''ٹوٹا ہوا پل'' سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

دور تک چھوڑ گیا ایک اندھیرے کی لکیر
یہ ستارہ کوئی بجھتا ہوا جگنو تو نہیں(۳)

اب تو سورج بھی ستارہ سا نظر آتا ہے
اب تو آنکھوں میں ستارے نہیں جچتے مجھ کو

اس مجموعے می غزلوں کی بہ نسبت نظموں میں سائنسی اشارات زیادہ ملتے ہیں۔ شہزاد کی ایک نظم ''ابھی تو نے دیکھا نہیں'' پیشِ خدمت ہے:

ابھی تو نے دیکھا نہیں آسماں کی طرف
ابھی تو زمینوں کے ذروں میں مصروف ہے
ابھی تو نے سوچا نہیں
یہ ستارے بہت دور ہوتے ہوئے بھی
بہت پاس کیوں ہیں؟
ابھی چاند کا آئینہ اتنا شفاف کیوں ہے
زمیں اپنے سینے پہ کہسار کا بوجھ لادے
کدھر جا رہی ہے!
یہ جھیلیں جو گدلا چکی ہیں
سسکتی ہوئی زرد دھرتی کے ناسور ہیں
اور یہ فصلیں جو اس وقت شاداب ہیں
کل جھلس جائیں گی
کل جو آیا نہیں
سب کی نظریں اسی پر لگی ہیں
مگر 'آج' جو آج موجود ہے کتنا بے مایہ ہے
وقت کی لہر بھی کیا عجب چیز ہے

جب گزرتی ہے احساس تک ہم کو ہوتا نہیں ہے
اور کہنے کو ہم بھی اسی لہر کے منتظر ہیں

اس مجموعے کی دیگر نثری نظمیں بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ''اپنی سالگرہ پر ایک نظم'' اور ''پھر یوں ہوا'' بھی سائنسی شعور کی عکاسی کرتی ہیں۔ ''پھر یوں ہوا'' کی اختتامی سطریں درج ذیل ہیں:

''اور اب وہ عورت میرے اندر
فنگس کی طرح پھیل گئی ہے
اور میں نے محفلوں میں جانا چھوڑ دیا''

اکثر ناقدین نے شہزاد احمد کے تبحر علمی اور شاعرانہ کمال کا اعتراف کیا ہے۔ شہزاد احمد کے معاصر ناقدین نے شہزاد کی شاعری میں نفسیاتی ژرف نگاہی، فلسفیانہ اندازِ فکر اور سائنسی شعور کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ کئی رسائل نے شہزاد احمد کے فکر و فن پر خاص نمبر اور خصوصی گوشے ترتیب دیے ہیں۔ اس ضمن میں ''سپوتنک'' اور ''وجدان'' کی کاوشیں قابلِ ستائش ہیں۔ ان رسائل و جرائد سے چند نامور ناقدین کی آرا سے شہزاد احمد کی شاعری میں سائنسی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے مضمون ''لامتناہیت کا لمس'' میں رقم طراز ہیں:

''ہمارے بیشتر شعرا سوچتے کم اور محسوس زیادہ کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کسی ''خیال'' کی اڑان ''جذبے'' کی کشش ثقل سے مات کھا جاتی ہے۔ خیال۔۔۔ خوشبو کی طرح سبک اور ہوا کی طرح متحرک ہوتا ہے۔ وہ عمومی اور افقی، دونوں جہات میں پھیلتا ہے۔ رشتوں میں خود منکشف اور اڑان میں خود کو بے پایاں کرتا ہے۔ خواہش کی فوری تسکین کے عمل کو ملتوی کرتے رہنا خیال کا امتیازی وصف ہے۔ جب کہ جذبہ ایک بھاری اور وزنی شے ہے جو فوری تسکین کا طالب ہے۔ اس کا انداز مائل بہ مرکز یعنی Centripetal ہے نہ کہ خیال کی طرح مرکز گریز Centrifugal۔۔۔ وہ شعرا جن پر جذبہ غالب ہوتا ہے اپنے بدترین لمحات میں چوما چاٹی کی شاعری کرتے ہیں اور بہترین لمحات میں نیم سیاہی، نیم سماجی شاعری جو اخبار کی سرخیوں سے اپنے لیے مواد کشید کرتی ہے تاہم یہ شعرا بصری واقعات و سانحات کو بھی ایک جذباتی خروش کے ساتھ اپنی مخصوص آئیڈیالوجی کے زاویے سے پڑھتے ہیں اور بعض اوقات میلوڈرامائی رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شاعری جذبے سے منقطع ہو کر محض ''خیال'' کی اڑان کا منظر دکھاتی ہے۔ جذبہ تو اس ایندھن کی طرح ہے جو راکٹ کو اڑانے کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر راکٹ جب اس ایندھن کو خرچ کر کے مدار میں جا پہنچتا ہے تو ایندھن کا دست نگر نہیں رہتا۔ گو اس کی مہیا کردہ Thrust ہمہ وقت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ لہٰذا بڑی شاعری نہ تو جذبے کی Thrust کو منہا کرنے سے وجود میں آتی ہے اور نہ ''خیال'' سے بے تعلق رہ کر بڑی شاعری ان دونوں کا آمیزہ ہے۔

اس طولانی تمہید کا مقصد محض اس بات پر زور دیتا ہے کہ شاعر وہی اچھا ہے جو اپنی مہر بند شخصیت میں روزن بنا کر خود لامتناہیت کے لمس سے آشنا کرتا ہے۔ یعنی جو شخصیت کو منہدم کرنے کی بجائے اسے بصارت اور بصیرت سے آشنا کرتا ہے۔ اس بافت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مطالعہ کے دائرے کو کشادہ کرے۔ بالخصوص ایسے علوم کا مطالعہ کرے جو کائنات اکبر اور کائناتِ اصغر دونوں کے اندر ذرہ ذرہ تک جانے کا موقع فراہم کریں تا کہ اس کا وژن وسیع ہو۔

شہزاد احمد اردو کے ان معدودے چند شعرا میں سے ہیں جنھیں مسلسل مطالعہ نے معاصرین کے مقابلے میں کہیں بڑے تناظر میں اپنی تخلیقی اپج کی کارکردگی دکھانے کا موقع عطا کیا ہے۔ وہ ابتداً نفسیات کے طالب علم تھے اور نفسیات سے ان کا شغف آج بھی موجود ہے اس سلسلے میں انھوں نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ شہزاد احمد کائنات اصغر کی کنہ میں جھانکنے پر ہمیشہ سے مائل رہے ہیں۔ نفسیات کے حوالے سے انسانی دماغ ہی کائنات اصغر ہے۔ جس میں شعور، تحت الشعور اور لاشعور تہہ در تہہ موجود ہوتے ہیں۔ شہزاد احمد نے اس کائنات اصغر کا خوب مطالعہ کیا ہے جس کے گہرے اثرات ان کے کلام پر مرتسم ہوئے ہیں مگر شہزاد احمد نے محض ''اندر'' تک میں خود کو محدود نہیں رکھا۔ وہ ''باہر'' کے تہہ در تہہ عالم سے بھی آشنا ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے

کاسمولوجی (Cosmology) کے ایک اچھے طالب علم کی حیثیت میں جس بصیرت کے ساتھ ''کائنات اکبر'' کا مطالعہ کیا ہے وہ بے حد قابلِ تعریف ہے۔ کاسمولوجی کا مطالعہ انسان کو بیک وقت منحنی ہونے کا احساس دلاتا ہے اور بڑا ہوانے کا بھی! منحنی ہونے کا یوں کہ وہ خود کو ان گنت کہکشاؤں میں سے محض ایک کہکشاں کے ایک گمنام گوشے میں موجود ایک غیر اہم ستارے کے گرد گھومنے والے سیاروں میں سے ایک چھوٹے سے سیارے کی ایک ایسی مخلوق کی صورت میں دیکھتا ہے جو مکانی اعتبار سے موہوم ہے۔ جب کہ کائناتی وقت کے حوالے دیکھیں تو اس کو وجود میں آئے محض چند لمحے ہی ہوئے ہیں اور شاید اگلے ہی چند لمحوں میں اس کی عمر طبعی اپنے انجام کو پہنچ جائے گی۔ تاہم ساتھ ہی کائنات کا مطالعہ انسان کو بڑا ہونے کا احساس بھی بخشتا ہے کہ کس طرح ایک ذرۂ موہوم نے پوری کائنات کو اپنی مٹھی میں بھر لیا ہے۔

پرانے زمانے میں صوفیا اور ویدانتی جز و اور کل میں فرق نہیں کرتے تھے۔ اب طبیعیات نے بھی ان کی بات کو قبول کر لیا ہے۔ اب وہ بھی یہ کہنے لگی ہے کہ ہر پارٹیکل کائنات کے جملہ پارٹیکلز پر محیط ہوتا ہے۔ شہزاد احمد کو نفسیات اور کاسمولوجی، دونوں علوم نے بے حد فائدہ پہنچایا ہے۔ اپنی شاعری میں ایک طرف تو وہ ''جزو'' کے اعماق میں اترے ہیں اور دوسری طرف ''کل'' کے اعماق ہیں، مگر وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے ہیں کہ ان دونوں یاتراؤں میں وہ ایک ہی برتر منزل کی طرف گامزن تھے۔ انکشاف سے ان کے وژن میں جو وسعت آئی ہے اس کا گہرا اثر ان کی شاعری پر بڑا ہے۔ بالخصوص غزل میں انھوں نے جس وژن کی موجودگی کا احساس دلایا ہے وہ شاید ہی ہمارے آج کے غزل گو شعرا میں سے کسی کو نصیب ہوا ہو۔'' (۴)

ریاض احمد نے اپنے مضمون ''شہزاد احمد ___ علمی شعور کی تخلیقی جہت'' میں شہزاد احمد کی شاعری میں فلسفے، نفسیات اور سائنسی شعور کو بے حد سراہا ہے۔ ریاض احمد لکھتے ہیں کہ شہزاد احمد نے شروع فلسفے اور نفسیات پر توجہ دی اور بعد ازاں انھوں نے اپنی توجہ جدید تر سائنسی علوم پر مرتکز کر دی۔ سائنسی علوم نے یہ

بات واضح کر دی ہے کہ یہ کرۂ ارض کائنات کا محور و مرکز نہیں یہ تو وسیع کائنات میں ایک ذرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ریاض احمد رقم طراز ہیں:

> ''شہزاد احمد نے اس شعور کو جو نئے سائنسی علوم کے ذریعے انسان کو عطا ہوا ہے۔ اسے ایک فرد کے بطن میں جذب ہو کر، وہاں سے من و تو کے تخلیقی مکالمے کی صورت میں برآمد کیا ہے۔۔۔ شہزاد احمد نے اپنے لیے ایک نیا تخلیقی محاورہ ایجاد کیا ہے۔ یہ محاورہ لفظوں کی توڑ پھوڑ پر مشتمل نہیں۔ یہ پرانے محاورے سے اتنا دامن کشیدہ بھی نہیں کہ اسے سمجھنے یا سمجھانے کے لیے کسی جدید شعریات کا علم حاصل کرنا ضروری ہو۔ شہزاد احمد کی غزل میں بھی زبان کے ایک نئے ذائقے کا احساس ہوتا ہے (چٹخارہ پرانی بات ہے اور سطحی بھی) اسی طرح نظم میں بھی اس نے لفظی چٹخارے کا سہارا نہیں لیا بلکہ معنوی گہرائی اور معنوی ربط سے الفاظ کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ ان کے ترکیبی عمل میں ایک تخلیقی انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔۔۔ مختصر یہ ہے کہ شہزاد احمد نے علمی شعور کو تخلیقی جہت بھی عطا کی ہے۔ اقبال نے بھی پرانے الفاظ کو نئے معانی عطا کیے تھے۔ اسی عمل کو شہزاد احمد نے ایک دوسری یعنی مادی علوم کی سطح پر فروغ دیا ہے۔ ایک اور اچھی بات یہ کہ اس نے اقبال کی کلاسیکی بلند آہنگی اپنانے کی سعی نہیں کی۔ یہ بھی خود اعتمادی کی ایک دلیل ہے۔۔۔ ''اترے مری خاک پر ستارہ'' کی نظمیں انسان کو Haunt کرتی رہتی ہیں۔''(۵)

مبین مرزا اپنے مضمون ''سازِ سخن بہانہ ایست'' میں شہزاد احمد کے دو شعری مجموعوں ''اترے مری خاک پر ستارہ'' اور ''معلوم سے آگے'' میں شہزاد احمد کو سائنسی فکر کا ایک اہم شاعر قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اگر شہزاد احمد نے ''ابھی تو نے دیکھا نہیں'' اور ''اکائی'' ایسی چند نظمیں کہہ کر بھی اپنا دل ہلکا کر لیا ہوتا تو ہم انھیں ذرا بلند آہنگ داد دے کر اور اپنی تنقید کی سکہ رائج الوقت دو چار اصطلاحات برت کر کام چلا لیتے۔ اس کے بعد بھی اگر کچھ ضرورت پیش آتی تو پھر آخری جائے پناہ یعنی تصوف سے رجوع کرتے اور کچھ وجود و شہود

کے حوالوں سے اپنی تنقید کی کم مائیگی کا ازالہ اور شہزاد احمد کی خوشی کا سامان کرتے لیکن یہاں تو کھیل ہی دوسرا ہے۔ تصوف ہماری کلاسیکی شاعری سے لے کر عصرِ حاضر تک حیات و کائنات کے عمیق تر حقائق اور اس جہانِ رنگ و بو سے ماورا عوامل کے سیر و سفر کے بیان کا حوالہ رہا ہے۔ ہماری روایتی شاعری اور تنقید تخلیق کار کی روحانی جہت کو تیسری آنکھ یا چشم دل کے عنوان سے موسوم کرتی ہے لیکن امر حال یہ ہے کہ شہزاد احمد کی شاعری میں جو ہری تبدیلی کا یہ سفر کسی درجے میں سیر و سلوک کا سفر بنتا ہی نہیں۔ ان کے تا حال آخری دو مجموعوں ''اترے مری خاک پر ستارہ'' اور ''معلوم سے آگے'' کی نظمیں جو منظر نامہ بنتی ہیں وہ اس تیسری آنکھ یا چشم دل کی بصارت کا معجزہ نہیں ہیں۔ اشفاق احمد نے ''معلوم سے آگے'' کے فلیپ پر رائے دیتے ہوئے اس مجموعے کی نظموں کو ایک خدا پرست سیکولر صوفی کے معجزۂ فن کی نمود سے تعبیر کیا ہے۔ اشفاق صاحب میرے دیرینہ کرم فرما اور شفیق و محترم بزرگ ہیں لیکن مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس شاعری کے مطالعے کے بعد شہزاد احمد نے اس مجموعے (اور ''اترے مری خاک پر ستارہ'' میں بھی) اپنے روحانی سیر و سفر کا احوال نہیں سنایا ہے، نہ وارداتِ قلبی کی کیفیت رقم کی ہے اور نہ ہی انھیں مابعد الطبیعیاتی حقائق کی دریافت و بازیافت سے کوئی سروکار ہے بلکہ اس کے برعکس ہم ان مجموعوں کے شعری کینوس پر طبیعیات کی دنیا کو نئے ابعاد تک وسیع ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس دنیا میں ہمیں صرف اپنے اطراف کا جہاں یا صرف اس کرۂ ارض کی حکایت سننے کو نہیں ملتی بلکہ شہزاد احمد پوری کائنات اور اس کے وجود و نمود کو بود و نبود کے تناظر میں جاننے اور سمجھنے کی تگ و دو میں محو نظر آتے ہیں۔ اس کاوش و کد کے لیے انھوں نے اپنا میڈم سائنس کو بنایا ہے۔ فلسفہ اور نفسیات کے Discipline سے ان کی پرانی دل چسپی اس جستجو میں ہمہ وقت ان کو کمک پہنچاتی رہتی ہے۔

شہزاد احمد کے یہ دونوں مجموعے عقلی، فکری اور سائنسی فلٹرز کے

ذریعے غور و خوض کرنے والے دماغ کے فکر و نظر کا اشاریہ ہیں۔ یہ اشارہ جس تخلیقی اپروچ سے مملو ہے اور جس وسعت و ہمہ گیری کو محیط ہے وہ اس سے پہلے ہماری شاعری تو کجا تنقیدی اور فکری کتابوں تک میں نظر نہیں آتا۔ شہزاد احمد کا اصل کریڈٹ یہی تو ہے کہ انھوں نے اپنے ان دو مجموعوں کے ذریعے ہم عصر شعری منظر نامے کو ایک ایسا نیا اور گہرا پھیلاؤ دیا ہے جو عقلی، فکری اور سائنسی ہونے کے باوجود بلا کی تخلیقی اثر آفرینی رکھتا ہے۔ لہٰذا ہم انھیں سیدھے سبھاؤ صوفی صافی قرار دے کر نہ صرف ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکیں گے بلکہ خود اپنی شعری روایت خصوصاً مابعد الطبیعیاتی شعری روایت کے ساتھ بھی غیر ذمہ دارانہ سلوک کے مرتکب ہوں گے۔

ان دونوں مجموعوں میں جو اصلاً ایک ہی موضوع کو اس کے تسلسل اور مختلف جہات اور وسیع تر تناظر میں دیکھتے ہیں۔ شہزاد احمد نے ایک طرف جدید انسان جو فلسفے کے نئے نظریات، نفسیات کی جدید تھیوریز اور سائنس کے نو بہ نو انکشافات کا گہرا شعور رکھتا ہے، کے قلب و نظر کی کیفیات کو بیان کیا ہے۔

دوسری طرف انھوں نے اس کائنات کو سمجھنے اور اس کی رنگا رنگی اور متنوع مظاہر میں اس کے معنی دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ معنی کی دریافت و بازیافت کا عمل ویسے تو خواہ کسی بھی ڈسپلن کے تحت کیا جائے، اس کا سفر خطِ مستقیم میں ممکن نہیں ہوتا لیکن جن سوالات اور مسائل کا ان دونوں مجموعوں میں شہزاد احمد کو سامنا رہا ہے۔ ان کے بارے میں تو پورے وثوق سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ متواتر بنتے بگڑتے اور الجھتے سوالوں کے ساتھ دائرہ در دائرہ سفر کرتے رہے ہوں گے۔۔۔ بلکہ اس دوران بعض سوالوں نے تو اس اندھرے کنویں کی افسانوی شکل اختیار کی ہوگی جس کے خود پکارنے والے کی آواز (یعنی شاعر کا سوال) پلٹ کر آتے ہوئے عفریت کی آواز بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ یہاں کتنے ہی مقام ایسے گزرتے ہیں جہاں ایک مہیب Universal Paradox سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

مگر شاید وہ اک لمحہ نہیں گزرا کہ جس میں روشنی رفتار بنتی ہے ہر اِک شے اپنی اپنی خودکشی کے واسطے تلوار بنتی ہے (زمانے ان گنت گزرے) نظموں کے ان اقتباسات سے آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ شاعر کا وجدان جس Spehere کی سیاحت کا احوال بیان کر رہا ہے وہاں بہ یک وقت ہستی اور نیستی کے احساس کی طنابیں پوری قوت کے ساتھ کھنچی ہوئی ہیں۔ یہ سیاحت جس لمحے نئے کائناتی معنی کی دریافت کا سفر بن رہی ہے۔ عین اسی لمحے انسانی وجود مکمل Absurdity کے مقام تک پہنچا دیتی ہے۔ اس وقت ہم Being اور Nothingness کے پرانے تصورات سے اپنا کام نکال سکتے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں زمان و مکاں کی دوئی کا تصور ہماری مدد کو نہیں آتا اور نہ ہی اپنے Homosapiang ہونے کا غرہ ہمیں کچھ دلاسہ دیتا ہے۔ یہاں ہم بالکل نہتے اور بے یار و مددگار ہیں۔ کائنات کے اس مہیب سناٹے میں ازلی شکست و ریخت اور نوع انسانی کی بے وقعتی کے ہزار عفریت بہ یک ساعت ہم پر یلغار کر رہے ہیں۔ یہ ایک کائناتی Deconstruction اور ہزاروں برسوں کے اشرف المخلوقاتی احساس کی Degeneration کا اندوہ ناک مرحلہ ہے۔ اب تخریب میں تعمیر کا سراغ پانے اور لایعنیت کے پاتال سے معنویت کو برآمد کرنے کی خواہش کام کر رہی ہے۔ کم تری، بے مائیگی اور فنا پذیری کے جاں گسل احساس سے برتری اور زندگی کا اسم اعظم سیکھنے کی آرزو کائنات کے معنوی اثبات کے لیے نبرد آزما ہے۔ انسان کی اشرف المخلوقاتی کو ذرا گھڑی بھر کے لیے ایک طرف رکھ کر ملاحظہ کیجیے کہ شاعر کا ذہن کس کرب ناک تجربے سے دوچار ہے کہ وہ زندگی کا تخلیقی تسلسل کسی اور مخلوق میں تلاش کر رہا ہے؟ دیکھیے اسے کن کن سوالوں اور احساس کی کیسی Fractions کا سامنا ہے۔''(۶)

ڈاکٹر فوزیہ چودھری نے اپنے مضمون ''شہزاد احمد کٹھن منزلوں کا شاعر'' میں شہزاد احمد کے شعری مجموعے ''معلوم سے آگے'' کو نثری نظموں کی ایک حیرت انگیز اور بہجت بخش کتاب قرار دیا ہے۔ شہزاد احمد غزل کے ایک پختہ اور قادر الکلام شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن اس کتاب میں پہلی

مرتبہ انھوں نے منظومات یا نثری نظموں میں اپنا مافی الضمیر بیان کیا ہے۔ یہ شعری مجموعہ صرف پیرایہ اظہار کی تبدیلی کے باعث قابلِ توجہ نہیں بلکہ اس کا موضوعاتی تنوع بھی قارئین کو خوشگوار حیرت اور ذہنی انبساط عطا کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر فوزیہ چودھری:

> ''شہزاد احمد کی نظم نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے جو چیز ہمیں سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ان کا موضوعاتی تنوع ہے۔ ان کی نظمیں ذات سے لے کر کائنات تک مختلف اور متنوع مضامین اور افکار پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں ذاتی تجربے بھی ہیں، نفسیاتی حوالے بھی ہیں، علاقائی اور سماجی حوالے سے بھی بہت سی وارداتوں کا اظہار ہوا ہے اور کچھ نظمیں گلوبل حوالے سے بھی اپنی معنویت آشکارا کرتی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں مختلف زمانوں کو آمیز کیا ہے۔ ان کا تخلیقی شعور ماضی، حال اور مستقبل کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے بلکہ خوشی اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ اس عصر کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نظم میں مابعد کی بات بھی کی ہے۔ ان نظموں میں بعض موضوعات ماورائے مستقبل کے مسائل سے کشید کیے گئے ہیں۔ ان کی شاعری کا یہ حصہ معنوی طور پر سب سے زیادہ بلیغ ہے۔ جہاں وہ کسی اور ہی زمین اور کسی اور ہی زمانے کی بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسے مابعد کہیے، ماورا کہیے، ماسوا کہیے یا کچھ اور یہ انسان کی ذات سے آگے Beyond کی ایسی آگہی ہے جو نیوکلیئر فزکس، میٹا فزکس اور ای ایس پی، ماورائے حسیات تصور Extra Sences Perception کے علوم میں زیرِ بحث آتی ہے مگر شاعری میں اس کا استعمال کم کم ہوا ہے۔ یہاں شہزاد احمد کے اسلوب پر اظہارِ اخیال کی بجائے ان کی شاعری کے اس پہلو کو زیرِ بحث لانے کی ضرورت ہے جو ان کے موضوعات سے متعلق ہے۔ ہماری شاعری کے لیے یہ موضوعات ایک نئے ذائقے کے مترادف ہیں۔ شاعری ویسے تو ہمیشہ ہی سے معلوم سے نامعلوم اور شے سے لاشے کی طرف سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن شہزاد کی نظموں میں ایک ایسے جہان معانی کو متعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے جو ''معلوم سے آگے'' کا جہان ہے۔

''معلوم سے آگے'' کے مضامین اور مسائل خود اتنے مبہم اور پیچیدہ ہیں کہ ابھی بعض سائنس دانوں اور دانش وروں کی آنکھوں سے بھی ان کی ماہیت چھپی ہوئی ہے۔ ایسے حالات میں ان کو شعر کا موضوع بنانا بذاتِ خود ایک بڑی جرأت مندانہ کوشش ہے۔ شہزاد احمد اس حوالے سے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے تخلیق کے اس مرکزی دھارے میں رہتے ہوئے جو ان کی نسل سے خاص ہے۔ بالکل جدید ترین نسل کے لب و لہجے میں عمرانی، نفسیاتی، سائنسی اور سماجی حقائق کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے جینیٹک میک اپ سے اس طرح آگے بڑھنا بذاتِ خود ایک بڑی کٹھن منزل کے مسافر ہونے کے مترادف ہے۔''(۷)

''معلوم سے آگے'' کی دو نظمیں ملاحظہ کیجیے:

''مگر مجھے تو یہ لگتا ہے
کہ میں اس کائنات میں ہی کہیں موجود تھا
اور یہ کائنات میرے اندر چپک کر رہ گئی تھی
مگر یہ واقعہ ہوا کیسے؟
جیسے ذرے کے ساتھ بہت سی جہتیں چمٹی ہوئی ہیں
ممکن ہے یہ کائنات میری کوئی خاص جہت ہو
یہ کائنات جو لامحدود ہے لامتناہی ہے اور میں
وقت کا قیدی ہونے کے باوجود
ایک ایسے پرندے کی طرح آزاد ہوں جسے اڑنے کے لیے
نہ پروں کی ضرورت ہے نہ ہوا کی!!(۸)

''اس کے خوابوں میں حرارت اس قدر شدید تھی
کہ وہ ہر لمحہ خود کو پگھلتا ہوا محسوس کرتا تھا
شاید اس کے اندر وہی عمل کارفرما تھا
جو سورج کے اندر جاری و ساری ہے
لیکن سورج تو پچھلے کئی لاکھ برس سے اس عمل کا شکار تھا
اس کے باوجود اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی

اس کے برعکس وہ محسوس کرتا تھا
کہ وہ اگر چند لمحے اور اس عمل سے باہر نہ آیا
تو وہ ختم ہو جائے گا
اور اس کی راکھ تک باقی نہ بچے گی''(۹)

شہزاد احمد کے سائنسی شعور نے اردو شاعری کو ثروت مند بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شہزاد احمد، صدف، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء

۲۔ مختار صدیقی، شہزاد احمد کی شاعری، مشمولہ: سپوتنک، لاہور، جلد ۱۱، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۰۰ء، ص: ۲۷

۳۔ شہزاد احمد، ٹوٹا ہوا پل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء

۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، لامتناہیت کا لمس، مشمولہ: سپوتنک، لاہور، جلد ۱۱، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۰۰ء، ص: ۲۵۔۲۳

۵۔ ریاض احمد، شہزاد احمد علمی شعور کی تخلیقی جہت، مشمولہ: سپوتنک ، لاہور، جلد ۱۱، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۰۰ء، ص: ۳۳۔۳۲

۶۔ مبین مرزا، سازِ سخن بہانہ ایست، مشمولہ: سپوتنک، لاہور، جلد ۱۱، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۰۰ء، ص: ۸۶۔۸۳

۷۔ فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، شہزاد احمد کٹھن منزلوں کا شاعر، مشمولہ: وجدان، لاہور، شمارہ ۱۸، اپریل ۲۰۰۹ء، ص: ۸۱

۸۔ شہزاد احمد، معلوم سے آگے، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۶۴

۹۔ ایضاً، ص: ۱۶۹

☆.....☆.....☆